دین کی غربت اور تہذیب مغرب

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

دین سے انحراف، اسلامی تعلیمات سے بیگانگی اور قرآن و سنت کے فہم سے عاری پن نے اسلامی زندگی کو ہمارے لیے اجنبی اور غیر بنا دیا ہے۔ کسی تعلیم، کسی اخلاقی قدر، کسی قرآنی تقاضے اور حکم سے عملی واسطہ پڑتا ہے تو تعجب ہی نہیں، خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام سے ہم آہنگی اور اپنائیت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسے اختیار کرتے اور عملی زندگی کے تقاضوں کو اس کی روشنی میں پورا کرتے ہوئے جھجک ہی نہیں، شرم و ندامت سی محسوس ہوتی ہے۔ مفاد خطرے میں پڑتے نظر آتے ہیں؛ ترقی کی راہیں مسدود دکھائی دیتی ہیں معاشرے میں نکو پن جلنے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ معاملات و تعلقات میں دقتیں دکھائی دیتی ہیں۔ رشتوں ناطوں کے امکانات گم ہونے کا ڈر دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اونچے طبقے میں جگہ نہ ملنے کا دھڑکا سا لگ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلے پہل دعوتِ حق اپنے قریبی ماحول میں سانس لینے والے افراد کے سامنے رکھی اور اسلام کے اصول و احکام سنانا شروع کیے ______ تو ایسی ہی فضا تھی۔ لوگ اس دعوت کو عجوبہ سمجھتے اور اس کے اصولوں کو عجیب تصور کرتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ اس طرح کی باتیں بروئے عمل آتی ہیں اور وہ بد کتے تھے کہ اس طرح کی تعلیمات کے تابع ہو کر جینا ہے۔ اس فضا اور ماحول کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حقیقت ترجمان سے صادر ہونے والے ان الفاظ میں اشارہ موجود ہے جو مسلم اور ترمذی کی حدیث میں آئے ہیں: بَدَأَ الاِسْلَامُ غَرِیْبًا۔ یعنی آغاز میں اسلام لوگوں کے لیے بالکل اجنبی دین اور اچنبے کی چیز تھی۔ لوگ

اس فضائے اجنبیت میں حیرت زدہ ہو کر پوچھتے تھے کہ اس دین کے احکام اور اس کی تعلیمات پر عمل بھی ہو سکتا ہے!۔ اور آج دین کو پھر وہی مرحلہ درپیش ہے۔ یہ لوگوں کے لیے بے گانہ اور اجنبی بن کر رہ گیا ہے کہ وہ صورت سامنے ہے کہ جس کو ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے۔ گویا وہ مرحلہ آ گیا ہے جس کی خبر مذکورہ بالا حدیث کے دوسرے جملے میں دی گئی ہے وَسَيَعُودُ غَرِيبًا کہ پھر یہ لوگوں میں حیرت خیز اور بالکل ان ہونی اور انوکھی چیز متصور ہوگا۔

دین کی از سرِ نو غربت کا سبب

صدیوں سے یہ دین، اپنی تمام تر سچائی اور راستی و عظمت کے باوجود، عملی زندگی سے خارج ہے۔ ایک نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات کے طور پر اسے پہچاننے میں اسی لیے دقت محسوس کر رہے ہیں کہ ہم اس کے مطابق زندگیاں گذارنے کے عادی بنے ہی نہیں اور اسے ضابطہ و دستور مان کر نہ چلے، نہ کسی کو چلتا دیکھا۔ ہمارے معاملات، اخلاق اور اجتماعی معاملات اس دینِ حق کی تعلیمات سے متصادم چلے آ رہے ہیں۔ ہماری معیشت، سیاست، حکومت، قانون سازی، تجارت، تعلیم اور دوستی و دشمنی اور صلح و جنگ سب اسلام سے ناآشنا اور اس کے اثر سے بالکل آزاد ہیں۔ یہ اجتماعی نظام اور رہنمائے حیات ہونے کی حیثیت سے بلکہ نرے فلسفے کے طور پر ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس سے عقیدت رکھ لینا ہی دین داری قرار پایا۔ اس بے گانگی اور اجنبیت کا ایک دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عقیدت کے باریک اور کمزور دھاگے کو سلامت رکھنا بھی ترقی و تعمیر کے منافی محسوس ہونے لگا۔ اس دھاگے کو توڑنا روشن خیالی، ترقی پسندی اور مہذب ہونے کی علامت خیال کیا جانے لگا۔

جن کے ہاں یہ دھاگہ ٹوٹنے سے بچا اُنھوں نے بھی اسے ساری زندگی اور زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہونے والے دین کے طور پر اپنانے کے بجائے اس کے بعض فرعی اور جزئی چیزوں کو اصل اور کُل گمان کر کے اِنھی پر اپنی دینداری کی عمارت تعمیر کی۔ یہ عمارت صحیح اور مکمل اسلام کی آئینہ دار ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس عمارت کے اجزائے تعمیر میں آیت کریمہ کا ختم، میلاد کی محفلیں، شب برات کے کھانے، مرنے والوں کے ایصالِ ثواب

کے لیے شریعت کے منافی رہیں، رمضان کے روزے سے زیادہ عید الفطر اور حج سے زیادہ عید الاضحیٰ کے کھانوں، دعوتوں، لباسوں، سجاوٹوں اور رونقوں اور میلوں کو دین سمجھ لیا گیا۔

نظام اور رہنمائے حیات کے طور پر دین کو جب اختیار نہ کیا گیا، اسے تہذیبی سرچشمہ اور تمدنی معیار نہ مانا گیا تو ایک اعتقادی، تہذیبی اور روحانی خلا پیدا ہو گیا۔ جس طرح یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب کسی مقام کی ہوا شدت گرمی سے ہلکی ہو کر اُوپر اُٹھتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والے خلا کو باہر سے آندھی اور طوفان بن کر تیز ہوا پُر کرتی ہے بالکل اسی طرح ہمارے معاشرے میں دین کے ہمہ جہتی رول کو روک کر جو خلا پیدا کیا گیا تھا اُسے قریب کے ہندوانہ رسم و رواج اور فرنگی تہذیب کے طوفان نے پُر کر دیا۔ تہذیبِ جدید اور نظامِ سرمایہ داری کے اقدار و روایات نے بہت کم عرصے میں ہمارے ذہنوں کو مسحور کر لیا اور ہمارے دلوں پر قبضہ جما لیا۔

تہذیبِ مغرب کا مزاج

اس تہذیب و نظام کا خمیر ظاہر داری، چمک دمک، شان و شوکت، لذت پرستی، تن آسانی، آسائشات طلبی اور تعیش و بندگیِ تن سے اُٹھا ہے۔ راحت و آسائش کا حصول اور جن جن حصوں کو استلذاذ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اُن سے لذت یاب ہونے کی اس تہذیب نے کھُلی چھُٹی دے دی۔ فطری پابندیاں، ضبطِ نفس، شائستگی اور وقار، حلال و حرام کا تصوّر، جائز و ناجائز کا احساس، سب کو اس تہذیب کا سیلِ بے پناہ بہا کر لے گیا۔ خدائے حقیقی کی بندگی چھوڑ کر عیش کوشی اور لذات طلبی کا فلسفہ خدا بن گیا۔ اِسی کی پُوجا ہونے لگی۔ انسانی زندگی کا ہر سانس اِسی مصنوعی خدا کی پرستش کے لیے صَرف ہونے لگا۔ اِس سے لازمی طور پر کچھ اخلاقی عوارض نے جنم لیا۔ خود غرضی، نفس پرستی، حرص و ہوس اور پیچھے خدا کو فراموش کرنا اس مادی تہذیب کا اصل الاصول ٹھہرایا گیا۔ اِس تہذیب کے اس پہلے سبق کو ہمارے ہاں کے "ہونہار اور قابل" لوگوں نے اچھی طرح سے رٹ لیا۔ اور پیرویِ یہود و نصاریٰ اور تقلیدِ ہنود میں لگ گئے۔ ایثار و قربانی، مروّت و ہمدردی، عطاء و نوازش، مساوات اور احترامِ آدمیت

کے اسلامی تصور کو پسِ پُشت ڈال کر ہر کوئی اِس مادّی دوڑ اور مقابلے میں شامل ہوگیا اور سب کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے نکل جانے کی دُھن سوار ہوگئی۔

اِسلام کا مزاج اِن منفی اور پست رویوں کے مقابلے میں اسلام نے تعلیم دی ہے کہ محروموں کو نوازو، پڑوسیوں کا خیال رکھو، یتیموں کی سرپرستی کرو، بے کسوں کا سہارا بنو، گرے ہوؤں کو تھامو، پریشان حالوں کا دُکھ درد بٹاؤ، مصیبت زدوں کے کام آؤ، غلاموں اور ملازموں کے حقوق کا خیال رکھو، جو خود کھاؤ وہی انھیں کھلاؤ اور جیسا خود پہنو ویسا ہی اُن کو پہناؤ، حق دار کی حق رسی کرو، عدل و انصاف کی میزان کو گرنے نہ دو۔ عیش و عشرت کے دلدادہ نہ بنو، سادگی اور قناعت کی روش اپناؤ، کھانے کے لیے نہ جیو، جینے کے لیے کھاؤ اور بلند مقصد کی خاطر جیو۔ اپنے مَن اور تن کی پرستش میں نہ لگے رہو۔ ربِ کائنات کی عبادت و اطاعت کو اپنا شعار بناؤ۔ نفس کے بندے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے نہ بنو۔ اِسی دُنیا کو اپنی منزل نہ سمجھو، سامانِ دُنیا پر ریجھ نہ جاؤ۔ اپنی کوششوں اور کاوشوں کو اسبابِ دُنیا میں صرف نہ کرو۔ چند روزہ راحت اور عارضی و فانی لذتوں کی خاطر دائمی اور ہمیشہ ہمیشہ کے اُس عیش کو نہ بھولو جو جنت میں تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ اِس عارضی اور ناپائیدار دُنیا کے حصول کے لیے آپس میں مقابلہ نہ کرو، بلکہ حق، سچائی، نیکی، اطاعت اور بندگی اور دینی علم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ دُنیاوی اسباب اور مال و دولت میں اپنے سے بڑھے ہوئے لوگوں پر رشک و حسد کی نگاہ نہ ڈالو، بلکہ ان کو قابلِ رشک سمجھو جو اسلام کے لیے سب کچھ قربان کر کے حق کا بول بالا اور اسلامی نظام کو غالب کرنے کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور اللہ کی جنتوں کے حق دار بن رہے ہیں۔

یہ وعظ و تلقین اور اُصول و تعلیمات مغرب زدہ ذہنوں اور تہذیبِ جدید پہ فریفتہ ہو جانے والوں کو عجیب اور ناگوار لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ دینِ اسلام سے اپنا رشتہ مردم شماری کے رجسٹر کے سوا کسی اور رُخ سے نہیں رکھتے۔ اِن سطور میں اِس طبقے کا ذکر ضرور آیا ہے لیکن صرف اس کے مزاج کی عکاسی کے لیے۔ یہاں ہماری اصل بحث ایک ایسے طبقے

سے ہے جو عجیب مخمصے اور شدید اُلجھن میں مبتلا ہے۔ جس کی پریشانی یہ ہے کہ پرواز دل و فکر کبھی رُخِ تہذیبِ نو کی طرف لپکتا ہے اور کبھی شمعِ اسلام کے گرد منڈلاتا ہے۔ نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن والا معاملہ آ پڑا ہے۔ دین اور دنیا پرستی کے درمیان معلّق کھڑا ہے۔ دین کو پورے کا پورا ہاتھ سے چھوڑنے پہ آمادہ ہے نہ دنیا کی لذتوں اور شیرینیوں سے دست بردار ہونا گوارا ہے۔ تھوڑا بہت دین بخشش کے من گھڑت تصور کے تحت گرہ میں باندھنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اور دین کی رُوح سے سراسر ٹکرانے والے مادّی اُصولوں کو بھی گلے سے لگائے رکھنے کا متمنی ہے۔ بیچ کے گروہ کا ہمیشہ سے یہی مسئلہ اور مشکل ہے۔ خدا کے ملنے کی توقع، ارادے کی کمی، عزم کی کمزوری اور نفس کی منہ زوری اور منافقت کے باعث نہیں ہے۔ اور وصال صنم اس لیے ممکن نہیں ہے کہ صنمِ دنیا کو اپنی پرستش میں دُوئی و شراکت اُسی طرح قبول نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی بندگی میں کوئی شریک منظور نہیں۔ اِس طبقے کے لوگ اندیشے کا شکار ہیں کہ سارا دین ہاتھ سے گیا تو جہنمی ثابت ہوں گے اور دَورِ نَو کی لذتوں اور مسرتوں اور سامانِ عیش کو ترک کیا اور سادگی اور دیندارانہ رنگِ عبادت اپنے اُوپر چڑھا لیا تو زندگی پھیکی اور بے کیف ہو جائے گی۔ اسلام سے تھوڑا سا تعلق اور اس کی تھوڑی سی سُوجھ بُوجھ مطلوب ہے۔ لیکن اس پہ عمل کرنے اور اس کے مطابق زندگی گذارنے کے خیال ہی سے ہزار وسوسے اور اندیشے ستانے لگتے ہیں۔ اِن اندیشوں کا اظہار کبھی زبانی اور کبھی عملی طور پہ ہوتا رہتا ہے۔

(باقی)